اوکسفرڈ
اُردو ورثہ
انتخابِ کلام
حالی
ترتیب و تعارف: رؤف پاریکھ

اُردو ورثہ

انتخابِ کلام

حالی

ترتیب و تعارف: رؤف پاریکھ

OXFORD
UNIVERSITY PRESS

اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس

OXFORD
UNIVERSITY PRESS

نمبر ۳۸، سیکٹر ۱۵، کورنگی انڈسٹریل ایریا، پی او بکس ۸۲۱۴،
کراچی۔ ۷۴۹۰۰، پاکستان

اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس یونیورسٹی آف اوکسفرڈ کا ایک شعبہ ہے۔ یہ دنیا بھر میں
درج ذیل مقامات سے بذریعہ اشاعت کتب تحقیق، علم و فضیلت اور تعلیم میں اعلیٰ معیار کے
مقاصد کے فروغ میں یونیورسٹی کی معاونت کرتا ہے:

اوکسفرڈ نیویورک

اوکلینڈ کیپ ٹاؤن دارالسلام ہونگ کونگ کراچی
کوالالمپور میڈرڈ میلبرن میکسیکو سٹی نیروبی
نیو دہلی شنگھائی تیپی ٹورونٹو

درج ذیل ممالک میں اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کے دفاتر ہیں:

ارجنٹائن آسٹریا برازیل چلی چیک ریپبلک فرانس یونان
گوئٹے مالا ہنگری اٹلی جاپان جنوبی کوریا پولینڈ پرتگال
سنگاپور سوئٹزرلینڈ ترکی یوکرین ویتنام

Oxford برطانیہ اور چند دیگر ممالک میں اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کا رجسٹرڈ ٹریڈ مارک ہے۔

پاکستان میں اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی سے شائع ہوئی۔

پہلی اشاعت ۲۰۱۱ء

ISBN 978-0-19-906276-8

پاکستان میں پکسل گرافکس، کراچی میں طبع ہوئی۔
امینہ سیّد نے اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس
نمبر ۳۸، سیکٹر ۱۵، کورنگی انڈسٹریل ایریا، پی او بکس نمبر ۸۲۱۴،
کراچی۔ ۷۴۹۰۰، پاکستان سے شائع کی۔

تعارف

خواجہ الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء تا ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء) کی ذہنی ساخت اور ادبی پرداخت میں جو عوامل واضح طور پر کارفرما رہے ان میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، اسد اللہ خاں غالب اور سرسید احمد خاں جیسی بھاری بھرکم شخصیات کے اثرات بھی شامل ہیں اور حالی کی ابتدائی تربیت اور ماحول کا بھی اس میں حصہ ہے۔ ابتدائی تعلیم عربی، فارسی، حدیث، تفسیر، فلسفے اور منطق کی ہوئی۔ متوسط طبقے کے شریف اور نجیب خاندان اور ماحول کے مخصوص تہذیبی اثرات کے تحت سادگی، محنت، خلوص، ہمدردی اور رواداری جیسے اوصاف ان کی شخصیت کا حصہ بن گئے اور بعد ازاں شاعری میں بھی جھلکے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے علاوہ لاہور میں بسلسلۂ ملازمت قیام کے دوران انگریزی ادب کے ترجموں کے مطالعے اور جدید شاعری کی لہر نے بھی ان کی شخصیت اور خیالات میں تغیر پیدا کیا۔ کہتے ہیں کہ غالب سے حالی نے نکتہ سنجی اور معنی آفرینی سیکھی اور شیفتہ کی صحبت نے ان کے ادبی ذوق کو اس طرح سنوارا کہ مبالغے کے لیے ناپسندیدگی پیدا ہوئی اور سادگی کو حسنِ بیان سے دلفریب بنانے کا گُر آیا۔ البتہ شیفتہ کی انگریز دشمنی (شیفتہ ''بغاوت'' کے الزام میں دھرے گئے اور آدھی جائیداد ضبط کر لی گئی) نے حالی پر کوئی اثرات مرتب کیے بھی ہوں گے تو سرسید کے نظریات نے انھیں صاف کر دیا ہوگا۔

حالی مغرب سے کس قدر حسنِ ظن رکھتے تھے اس کا اندازہ یوں لگایئے کہ ''مدوجزرِ اسلام'' جیسی نظم میں بھی وہ مغربی اقوام کی توصیف کا پہلو کسی نہ کسی طور نکال لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''مدار آدمیت کا ہے اب انھیں پر''، ''مطیع ان کا سارا جہاں ہے'' اور وہ ''برتر از آسماں'' ہیں، گو اس کا مقصد مسلمانوں کو غیرت دلانا یا عمل پر اُکسانا ہی کیوں نہ ہو۔

حالی نے نہ صرف ہمارے روایتی شعر و ادب پر کڑی نکتہ چینی کی اور اسے ''بے وقت کی راگنی''، ''ناپاک دفتر'' اور ''عفونت میں سنڈاس سے بدتر'' قرار دیا بلکہ یہ بھی کہا کہ ''جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے۔''

اسی طرح ان کا یہ اعلان کہ:

حالی اب آؤ پیرویٔ مغربی کریں بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

اسی ذہنیت کا غماز ہے جس کے تحت انھوں نے اردو کی ایک نئی شعریات کی بنیاد رکھی۔ مغرب کے لیے پسندیدگی کے پہلو بہ پہلو اسلام اور مسلمانوں کا درد اور ان کی زبوں حالی پر حالی کی دل سوزی ہر جگہ نمایاں ہے۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ مغرب کی چیرہ دستیوں کے بارے میں بھی شدید احساس رکھتے تھے اور آخرِ عمر میں ہندوستانیوں میں تجارت اور ہنر کے فروغ کو مغربی استعمار اور استبداد سے چھٹکارے کی صورت سمجھنے لگے تھے اور اسی لیے جب بیسویں صدی کے اوائل میں ''سودیشی تحریک'' چلی تو حالی نے اس کی پرزور حمایت کی۔ لیکن بقول پروفیسر ممتاز حسین کے:

> حالی نے انگریزوں کی سائنسی علوم پر دسترس اور تکنالوجی تک رسائی کی بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر کے تجارت اور ہنر سے امیدیں وابستہ کر لیں۔ البتہ تقسیم بنگال کی منسوخی نے حالی کے ذہن سے وہ جادو اُتار دیا جس کے زیرِ اثر انھیں برطانوی حکومت کی ہر چیز بھلی معلوم ہوتی تھی اور پھر اس کے ردِعمل میں ایسے اشعار لکھے جو انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف تھے۔ (حالی کے شعری نظریات، ص: ۲۷۵)

حالی کی شاعری اور نئے ادبی تنقیدی نظریات کی تخلیق کا بنیادی مقصد مسلمانوں اور بالخصوص برِعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کے زوال کے اسباب بیان کرنا اور ان کو اس زوال سے نجات کا راستہ بتانا تھا۔ ان کی معاشی اور اخلاقی پستی پر حالی کُڑھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ''وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر'' بھی اس کا ذمے دار ہے۔

حالی کی شاعری فنی طور پر بھی بہت بلند ہے۔ سادگی میں پُرکاری پیدا کرنا ان کا فن ہے۔ ان کا ذخیرۂ الفاظ حیرت انگیز تنوع پیش کرتا ہے۔ عجیب، نامانوس، قلیل الاستعمال اور غریب اللغت الفاظ و تراکیب کے استعمال کی بنا پر اردو کا کوئی لغت نویس حالی کی شاعری سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ حالی کے بعض اشعار اپنی تاثیر کی بنا پر ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں اور اس انتخاب میں بطور خاص شامل ہیں۔

ڈاکٹر رؤف پاریکھ

حمد

قبضہ ہو دلوں پر کیا اور اس سے سوا تیرا
اک بندۂ نافرماں ہے حمد سرا تیرا
گو سب سے مقدم ہے حق تیرا ادا کرنا
بندے سے مگر ہو گا حق کیونکہ ادا تیرا
محرم بھی ہے ایسا ہی جیسا کہ ہے نامحرم
کچھ کہہ نہ سکا جس پر یاں بھید کھلا تیرا
چھپتا نہیں نظروں میں یاں خلعتِ سلطانی
کملی میں مگن اپنی رہتا ہے گدا تیرا
تو ہی نظر آتا ہے ہر شے میں محیط ان کو
جو رنج و مصیبت میں کرتے ہیں گِلا تیرا
نشّے میں وہ احساں کے سرشار ہیں اور بے خود
جو شکر نہیں کرتے نعمت پہ ادا تیرا
سمجھا ہے پرے تجھ کو ادراک کی سرحد سے
جس قوم نے رکھا ہے انکار روا تیرا
طاعت میں ادب تیرا عصیاں سے ہے گو بڑھ کر
عصیاں میں ہے طاعت سے اقرار سوا تیرا
آفاق میں پھیلے گی کب تک نہ مہک تیری
گھر گھر لیے پھرتی ہے پیغام صبا تیرا
ہر بول ترا دل سے ٹکرا کے گزرتا ہے
کچھ رنگِ بیاں حالی ہے سب سے جدا تیرا

نظمیں

آزادی کی قدر

ایک ہندی نے کہا "حاصل ہے آزادی جنھیں
قدرداں اُن سے بہت بڑھ کر ہیں آزادی کے ہم
ہم کہ غیروں کے سدا محکوم رہتے آئے ہیں
قدر آزادی کی جتنی ہم کو ہو اُتنی ہے کم
عافیت کی قدر ہوتی ہے مصیبت میں سوا
بے نوا کو ہے زیادہ قدرِ دینار و دِرم
"تعرف الاشیاء بالاضداد"[1] ہے قولِ حکیم
دے گا قیدی سے زیادہ کون آزادی پہ دم"
سن کے اک آزاد نے یہ لاف[2] چپکے سے کہا
"ہے سقر[3] موری کے کیڑے کے لیے باغِ ارم"[4]

۱۔ "تعرف الاشیاءُ بالاضداد" (عربی کا مقولہ): ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔
۲۔ لاف: ڈینگ؛ بکواس۔
۳۔ سقر: سورج کی شدید تپش؛ جہنم؛ عذاب۔
۴۔ یعنی جس طرح موری کے کیڑے کو موری ہی میں آرام ملتا ہے اور وہاں سے کہیں جانا نہیں چاہتا اسی طرح جو قومیں ہمیشہ محکوم رہتی چلی آئی ہیں وہ غلامی ہی میں خوش رہتی ہیں۔ (حالی)

کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان

دو ملازم ایک کالا اور گورا دوسرا
دوسرا پیدل مگر پہلا سوارِ راہوار[1]

تھے سول سرجن کی کوٹھی کی طرف دونوں رواں
کیونکہ بیماری کی رخصت کے تھے دونوں خواستگار

راہ میں دونوں کی باہم ہوگئی کچھ ہُشت مُشت[2]
کوکھ میں کالے کی اک مُکّا دیا گورے نے مار

صدمہ پہنچا جس سے تلّی کو بہت مسکین کی
آ کے گھوڑے سے لیا سائیس نے اس کو اتار

ٹھوک کر کالے کو گورے نے تو اپنی راہ لی
چوٹ کے صدمے سے غش کالے کو آیا چند بار

آخرش کوٹھی پہ پہنچے جا کے دونوں پیش و پس[3]
ضارِب[4] اپنے پاؤں اور مضروب[5] ڈولی میں سوار

ڈاکٹر نے آ کے دونوں کی سنی جب سرگزشت
تہ کو جا پہنچا سخن کی سن کے قصہ ایک بار

۱۔ راہوار: گھوڑا۔
۲۔ ہشت مشت: لڑائی جھگڑا، مار پیٹ۔
۳۔ پیش و پس: آگے پیچھے۔
۴۔ ضارِب: ضرب لگانے والا، مارنے والا۔
۵۔ مضروب: جسے ضرب لگی ہو، جسے چوٹ آئی ہو۔

دی سند گورے کو لکھ، تھی جس میں تصدیقِ مرض

اور یہ لکھا کہ ''سائل[1] ہے بہت زار و نزار[2]

یعنی اک کالا نہ جس گورے کے مُکّے سے مرے

کر نہیں سکتا حکومت ہند پر وہ زینہار[3]''

اور کہا کالے سے ''تم کو مل نہیں سکتی سند

کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جاندار

ایک کالا پِٹ کے جو گورے سے فوراً مر نہ جائے

آئے بابا اس کی بیماری کا کیونکر اعتبار''

اِسراف

ایک مُسرِف[4] نے یہ مُمسِک[5] سے کہا ''کب تک اے ناداں یہ حُبِّ مال و زر

تو جو یوں رکھتا ہے دولت جوڑ جوڑ ہے سدا دنیا ہی میں رہنا مگر''؟

ہنس کے ممسک نے کہا ''اے سادہ لوح زر لٹانا رائیگاں اور اس قدر

آج ہی گویا نصیبِ دشمناں آپ کا دنیا سے ہے عزمِ سفر''

۱۔ سائل: سوال کرنے والا، درخواست گزار، عرضی دینے والا۔

۲۔ زار و نزار: کم زور، ناتواں، دُبلا پتلا۔

۳۔ زینہار: ہرگز۔

۴۔ مسرف: فضول خرچ، اسراف کرنے والا، بے جا خرچ کرنے والا۔

۵۔ ممسک: کنجوس، بخیل، تنگ دل۔

حُبِّ وطن

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو
اٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ
ورنہ کھاؤ پیو چلے جاؤ
جب کوئی زندگی کا لطف اٹھاؤ
دل کو دکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ
ایک ڈالی کے سب ہیں برگ و ثمر
ہے کوئی اُن میں خشک اور کوئی تر
مُقبِلو![1] مُدبَروں[2] کو یاد کرو
خوش دلو! غم زدوں کو شاد کرو
جاگنے والو! غافلوں کو جگاؤ
تیرنے والو! ڈوبتوں کو تراؤ
تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو
سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ملک ہیں اتفاق سے آزاد
شہر ہیں اتفاق سے آباد

۱۔ مُقبل: آگے آنے والا؛ اقبال مند، خوش نصیب؛ دولت مند۔
۲۔ مُدبَر: بدنصیب۔

چُپ کی داد

اے ماؤ، بہنو، بیٹیو، دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمھیں، قوموں کی عزت تم سے ہے

تم گھر کی ہو شہزادیاں، شہروں کی ہو آبادیاں
غم گیں دلوں کی شادیاں، دکھ سکھ میں راحت تم سے ہے

تم ہو تو غربت ہے وطن، تم بن ہے ویرانہ چمن
ہو دیس یا پردیس، جینے کی حلاوت تم سے ہے

فطرت تمھاری ہے حیا، طینت میں ہے مہر و وفا
گھٹی میں ہے صبر و رضا، انساں عبارت تم سے ہے

مونس ہو خاوندوں کی تم، غم خوار فرزندوں کی تم
تم بن ہے گھر ویران سب، گھر بھر کی برکت تم سے ہے

تم آس ہو بیمار کی، ڈھارس ہو تم بے کار کی
دولت ہو تم نادار کی عُسرت میں عشرت تم سے ہے

آتی ہو اکثر بے طلب، دنیا میں جب آتی ہو تم
پر موہنی سے اپنی یاں گھر بھر پہ چھا جاتی ہو تم

مد و جزرِ اسلام

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا
''مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا''
کہا ''دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا
کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا
مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں
کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں''

یہی حال دنیا میں اس قوم کا ہے
بھنور میں جہاز آ کے جس کا گھرا ہے
کنارہ ہے دور اور طوفاں بپا ہے
گماں ہے یہ ہر دم کہ اب ڈوبتا ہے
نہیں لیتے کروٹ مگر اہلِ کشتی
پڑے سوتے ہیں بے خبر اہلِ کشتی

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے
فلاکت[1] سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے
چپ[2] و راست[3] سے یہ صدا آ رہی ہے
کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

۱۔ فلاکت: مفلسی، ناداری۔
۲۔ چپ: اُلٹا (ہاتھ)، بائیں طرف۔
۳۔ راست: سیدھا (ہاتھ)، دائیں جانب۔

عرب جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا
جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا
زمانے سے پیوند جس کا جدا تھا
نہ کشورستاں تھا نہ کشورکشا تھا
تمدن کا اس پر پڑا تھا نہ سایہ
ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا
کہیں آگ پجتی تھی واں بے محابا
کہیں تھا کواکب پرستی کا چرچا
بہت سے تھے تثلیث[۱] پر دل سے شیدا
بتوں کا عمل سوبسو جابجا تھا
کرشموں کے راہب کے تھا صید کوئی
طلسموں میں کاہن کے تھا قید کوئی
جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دختر
تو خوفِ شماتت[۲] سے بے رحم مادر
پھرے دیکھتی جب تھی شوہر کے تیور
کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اس کو جا کر
وہ گود ایسی نفرت سے کرتی تھی خالی
جنے سانپ جیسے کوئی جننے والی

۱۔ تثلیث: عیسائی عقیدہ جس کے مطابق خدا (نعوذ باللہ) تین حصوں پر مشتمل ہے۔
۲۔ شماتت: کسی کے نقصان پر خوشی کا اظہار، دشمن کی کسی بات پر ہنسنے کا عمل۔

ہوئے محو عالم سے آثارِ ظلمت
کہ طالع ہوا[۱] ماہِ برجِ سعادت
نہ چٹکی مگر چاندنی ایک مدت
کہ تھا ابر میں ماہتابِ رسالت

یہ چالیسویں سال لطفِ خدا سے
کیا چاند نے کھیت[۲] غارِ حرا[۳] سے

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

خطا کار سے درگزر کرنے والا
بداندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا
قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا[۴] ساتھ لایا

۱۔ طالع ہونا: طلوع ہونا، نکلنا۔
۲۔ چاند کا کھیت کرنا: چاند کا نکلنا۔
۳۔ حرا: مکے کا ایک غار جہاں رسول ﷺ عبادت فرمایا کرتے تھے اور یہیں پہلی وحی نازل ہوئی۔
۴۔ کیمیا: عام دھات سے سونا بنانے کی ترکیب؛ یہاں مراد قرآنِ کریم سے ہے۔

مِس[1] خام کو جس نے کندن[2] بنایا
کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا
پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رخ ہوا کا

گھٹا اک پہاڑوں سے بطحا کے اٹھی
پڑی چار سُو یک بہ یک دھوم جس کی
کڑک اور دھمک دور دور اس کی پہنچی
جو ٹیکس[3] پہ گرجی تو گنگا[4] پہ برسی

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہوئی ساری کھیتی خدا کی

رہے جب تک ارکانِ اسلام برپا
چلن اہلِ دیں کا رہا سیدھا سادا
رہا مَیل سے شہدِ صافی مصفّا
رہی کھوٹ سے سیمِ خالص مبرّا

نہ تھا کوئی اسلام کا مردِ میداں
علَم ایک تھا شش جہت میں درخشاں

۱۔ مِس: تانبا؛ مِسِ خام یعنی کچا تانبا جو کان سے نکالنے کے بعد صاف نہ کیا گیا ہو۔
۲۔ کندن: خالص سونا۔
۳۔ ٹیکس: اسپین کے ایک دریا کا نام۔
۴۔ گنگا: ہندوستان کے ایک دریا کا نام۔ مراد یہ کہ اسلام اسپین سے ہند تک پھیل گیا۔

برے اُن پہ وقت آ کے پڑنے لگے اب
وہ دنیا میں بس کر اجڑنے لگے اب
بھرے ان کے میلے بچھڑنے لگے اب
بنے تھے وہ جیسے بگڑنے لگے اب
ہری کھیتیاں جل گئیں لہلہا کر
گھٹا کھل گئی سارے عالم پہ چھا کر

فلاکت جسے کہیے ام الجرائم
نہیں رہتے ایماں پہ دل جس سے قائم
بناتی ہے انسان کو جو بہائم
مصلّی ہیں دل جمع جس سے نہ صائم
وہ یوں اہلِ اسلام پر چھا رہی ہے
کہ مسلم کی گویا نشانی یہی ہے

یہ اے قومِ اسلام عبرت کی جا ہے
کہ شاہوں کی اولاد در در گدا ہے
جسے سنیے افلاس میں مبتلا ہے
جسے دیکھیے مفلس و بے نوا ہے
نہیں کوئی ان میں کمانے کے قابل
اگر ہیں تو ہیں مانگ کھانے کے قابل

مشقت کو محنت کو جو عار سمجھیں
ہنر اور پیشے کو جو خوار سمجھیں

تجارت کو کھیتی کو دشوار سمجھیں
فرنگی کے پیسے کو مُردار سمجھیں
تن آسانیاں چاہیں اور آبرو بھی
وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی

کسی قوم کا جب اُلٹتا ہے دفتر
تو ہوتے ہیں مسخ ان میں پہلے تونگر
کمال ان میں رہتے ہیں باقی نہ جوہر
نہ عقل ان کی ہادی نہ دیں ان کا رہبر
نہ دنیا میں ذلت نہ عزت کی پروا
نہ عقبیٰ میں دوزخ نہ جنت کی پروا

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ کا
کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالقِ دَو سَرا کا
خلائق سے ہے جس کو رشتہ ولا کا
یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

بہت لوگ پیروں کی اولاد بن کر
نہیں ذاتِ والا میں کچھ جن کے جوہر
بڑا فخر ہے جن کو لے دے کے اس پر
کہ تھے ان کے اسلاف مقبولِ داور
کرشمے ہیں جا جا کے جھوٹے دکھاتے
مریدوں کو ہیں لوٹتے اور کھاتے

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر
عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر
مَلَک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
ہوا علم و دیں جس سے تاراج سارا
وہ علموں میں علم و ادب ہے ہمارا

برا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے
عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے
مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

غرض عیب کیجے بیاں اپنے کیا کیا
کہ بگڑا ہوا یاں ہے آوے کا آوا
فقیہہ اور جاہل، ضعیف اور توانا
تاسف کے قابل ہے احوال سب کا
مریض ایسے مایوس دنیا میں کم ہیں
بگڑ کر کبھی جو نہ سنبھلیں وہ ہم ہیں

وہی ایک ہے جس کو دائم بقا ہے
جہاں کی وراثت اسی کو سزا ہے
سوا اس کے انجام سب کا فنا ہے
نہ کوئی رہے گا نہ کوئی رہا ہے
مسافر یہاں ہیں فقیر اور غنی سب
غلام اور آزاد ہیں رفتنی سب

ضمیمہ[۱]

بس اے ناامیدی نہ یوں دل بجھا تو
جھلک اے امید اپنی آخر دکھا تو
ذرا ناامیدوں کی ڈھارس بندھا تو
فسردہ دلوں کے دل آ کر بڑھا تو
ترے دم سے مُردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تُو نے سرسبز کی ہیں

مگر بیٹھ رہنے سے چلنا ہے بہتر
کہ ہے اہلِ ہمت کا اللہ یاور
جو ٹھنڈک میں چلنا نہ آیا میسر
تو پہنچیں گے ہم دھوپ کھا کھا کے سر پر
یہ تکلیف و راحت ہے سب اتفاقی
چلو اب بھی ہے وقت چلنے کا باقی

۱۔ مسدسِ مدوجزرِ اسلام جون ۱۸۷۹ء میں چھپی اور بہت مقبول ہوئی۔ لیکن اس کے تقریباً سات سال بعد مولانا حالی کو خیال آیا کہ ''یہ اسلوب جس قدر غیرت دلانے والا تھا اسی قدر مایوس کرنے والا بھی تھا...... افسردگی الفاظ میں سرایت کر گئی تھی۔ نظم کا خاتمہ ایسے دل شکن اشعار پر ہوا جن سے تمام امیدیں منقطع ہوگئیں۔'' چنانچہ انھوں نے تیسرے ایڈیشن (۱۸۸۶ء) میں نہ صرف ترامیم و اضافہ کیا بلکہ امید افزا اشعار کہہ کر اس میں ''ضمیمہ'' کے عنوان سے شامل کیے۔ اس ضمیمے میں ۱۶۲ بند ہیں۔ مسدس کی طرح اس کا بھی مختصر انتخاب پیشِ خدمت ہے (مرتب)۔

مشقت کی ذلت جنھوں نے اٹھائی
جہاں میں ملی ان کو آخر بڑائی
کسی نے بغیر اس کے ہرگز نہ پائی
فضیلت نہ عزت نہ فرماں روائی

نہال اس گلستاں میں جتنے بڑے ہیں
ہمیشہ وہ نیچے سے اوپر چڑھے ہیں

بس اب علم و فن کے وہ پھیلاؤ ساماں
کہ نسلیں تمھاری بنیں جن سے انساں
غریبوں کو راہِ ترقی ہو آساں
امیروں میں ہو نورِ تعلیم تاباں

کوئی ان میں دنیا کی عزت کو تھامے
کوئی کشتیٔ دین و ملت کو تھامے

الٰہی بحقِ رسولِ تہامی[1]
ہر اک فردِ انساں کا تھا جو کہ حامی
جسے دور و نزدیک تھے سب گرامی
برابر تھے مکی و زنگی و شامی

شریروں کو ساتھ اپنے جس نے نباہا
بُروں کا ہمیشہ بھلا جس نے چاہا

۱۔ تہامی: تہامہ سرزمین عرب میں ایک مقام ہے۔ تہامہ سے تعلق یا نسبت رکھنے والے کو تہامی کہتے ہیں۔ اسی نسبت سے رسول ﷺ کو رسولِ تہامی کہتے ہیں۔

طفیل اس کا اور اس کی عترت[1] کا یا رب
پکڑ ہاتھ جلد اس کی امت کا یا رب
اک ابر اس پہ بھیج اپنی رحمت کا یا رب
غبار اس سے جو دھوئے ذلت کا یا رب
کہ ملت کو ہے ننگ ہستی سے اس کی
ہوا پست اسلام پستی سے جس کی

انھیں کل کی فکر آج کرنی سکھا دے
ذرا ان کی آنکھوں سے پردہ اٹھا دے
کمیں گاہِ[2] بازیٔ دوراں دکھا دے
جو ہونا ہے کل آج ان کو سُجھا دے
چھتیں پاٹ لیں تا کہ باراں سے پہلے
سفینہ بنا رکھیں طوفاں سے پہلے

۱۔ عترت: اولاد؛ قریبی رشتے دار۔
۲۔ کمیں گاہ: گھات کی جگہ، وہ جگہ جہاں دشمن یا شکار کے لیے چھپ کر بیٹھتے ہیں۔

عرضِ حال[۱]

بجنابِ سرورِ کائنات علیہ افضل الصلوٰت و اکمل التحیات

۱۸۸۸ء

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

جو دین کہ تھا شرک سے عالم کا نگہباں
اب اس کا نگہبان اگر ہے تو خدا ہے

ہے دین ترا اب بھی وہی چشمۂ صافی
دیں داروں میں پر آب ہے باقی نہ صفا ہے

عالم ہے سو بے عقل ہے جاہل ہے سو وحشی
منعم ہے سو مغرور ہے مفلس سو گدا ہے

فریاد ہے اے کشتیٔ امت کے نگہباں
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے

صدمہ درِ دنداں کو ترے جن سے کہ پہنچا
کی ان کے لیے تو نے بھلائی کی دعا ہے

برتاؤ ترے جب کہ یہ اعدا سے ہیں اپنے
اعدا سے غلاموں کو کچھ امید سوا ہے

۱۔ عرضِ حال بھی مسدس کا حصہ ہے۔ ۱۸۸۸ء میں تصنیف ہوا۔

کر حق سے دعا امتِ مرحوم کے حق میں
خطروں میں بہت جس کا جہاز آ کے گھرا ہے

جو خاک ترے در پہ ہے جاروب سے اڑتی
وہ خاک ہمارے لیے داروئے شفا ہے

کل دیکھیے پیش آئے غلاموں کو ترے کیا
اب تک تو ترے نام پہ اک ایک فدا ہے

ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمھارے
نسبت بہت اچھی ہے اگر حال برا ہے

تدبیر سنبھلنے کی ہمارے نہیں کوئی
ہاں ایک دعا تیری کہ مقبولِ خدا ہے

خود جاہ کے طالب ہیں نہ عزت کے ہیں خواہاں
پر فکر ترے دین کی عزت کی سدا ہے

گر دین کو جوکھوں نہیں ذلت سے ہماری
امت تری ہر حال میں راضی بہ رضا ہے

عزت کی بہت دیکھ لیں دنیا میں بہاریں
اب دیکھ لیں یہ بھی کہ جو ذلت میں مزا ہے

ہاں حالیؔ گستاخ نہ بڑھ حدِ ادب سے
باتوں سے ٹپکتا تری اب صاف گِلا ہے

ہے یہ بھی خبر تجھ کو کہ ہے کون مخاطب
یاں جنبشِ لب خارج از آہنگِ خطا ہے

قطعات

شعر سے خطاب

اے شعرِ دل فریب نہ ہو تُو تو غم نہیں — پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تُو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام — ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں — تحسینِ روزگار سے ہے بے نیاز تو
تو نے کیا ہے بحرِ حقیقت کو موج خیز — دھوکے کا غرق کر کے رہے گا جہاز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمانِ شاعری — قبلہ ہو اب اُدھر تو نہ کیجو نماز تو
ناک اوپری دوا سے تری گر چڑھائیں لوگ — معذور جان ان کو جو ہے چارہ ساز تو
چپ چاپ اپنے سچ سے کیے جا دلوں میں گھر — اونچا ابھی نہ کر عَلَمِ امتیاز تو
اے شعر راہِ راست پہ تو جب کہ پڑ لیا — اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو
کرنی ہے فتح گر نئی دنیا تو لے نکل — بیڑوں کا ساتھ چھوڑ کے اپنا جہاز تو
ہوتی ہے سچ کی قدر پہ بے قدریوں کے بعد — اس کے خلاف ہو تو سمجھ اس کو شاذ تو
جو قدرداں ہو اپنا اسے مغتنم سمجھ — حالی کو تجھ پہ ناز ہے کر اس پہ ناز تو

نکتہ چینی

باپ نے بیٹے کو سمجھایا کہ علم و فضل میں — جس طرح بن آئے بیٹا نام پیدا کیجیے
کیجیے تصنیف اور تالیف میں سعیٔ بلیغ — اس میں ایک اپنا پسینا اور لہو کر دیجیے
دیجیے معنی کے نظم و نثر میں دریا بہا — اور سخن کی داد ہر پیر و جواں سے لیجیے
اور نہ ہو گر شعر و انشا کی لیاقت آپ میں — شاعروں اور منشیوں[1] پر نکتہ چینی کیجیے

۱۔ منشی: انشاء پرداز، نثر نگار، مصنف، لکھنے والا۔

رباعیات

توحید

ہستی سے ہے تیری رنگ و بو سب کے لیے
طاعت میں ہے تیری آبرو سب کے لیے
ہیں تیرے سوا سارے سہارے کم زور
سب اپنے لیے ہیں اور تو سب کے لیے

نعت

زُہّاد کو تو نے محوِ تمجید کیا
عشاق کو مستِ لذتِ دید کیا
طاعت میں رہا نہ حق کی ساجھی کوئی
توحید کو تو نے آ کے توحید کیا

عشق

ہے عشق طبیب دل کے بیماروں کا
یا گھر ہے وہ خود ہزار آزاروں کا
ہم کچھ نہیں جانتے پہ اتنی ہے خبر
اک مشغلہ دلچسپ ہے بیکاروں کا

عالم و جاہل میں کیا فرق ہے

ہیں جہل میں سب عالم و جاہل ہم سر
آتا نہیں فرق اس کے سوا ان میں نظر
عالم کو ہے علم اپنی نادانی کا
جاہل کو نہیں جہل کی کچھ اپنے خبر

جس کو زندگانی کا بھروسا نہیں وہ کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا

دنیا کو ہمیشہ نقشِ فانی سمجھو[1]
رودادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

سببِ زوالِ سلطنت

دیکھو جس سلطنت کی حالت درہم
سمجھو کہ وہاں ہے کوئی برکت کا قدم
یا تو کوئی بیگم ہے مشیرِ دولت
یا ہے کوئی مولوی وزیرِ اعظم

۱۔ یہ مصرع بالعموم یوں چھپا ہے: دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو
لیکن رباعیاتِ حالی (مرتبہ: اسمٰعیل پانی پتی) میں خود مولانا حالی کی ترمیم کے بعد یہ مصرع منقولہ بالا صورت میں ہے۔ (مرتب)

عفو باوجودِ قدرتِ انتقام

موسیٰ نے یہ کی عرض کہ "اے بارِ خدا
مقبول ترا کون ہے بندوں میں سوا"؟
ارشاد ہوا "بندہ ہمارا وہ ہے
جو لے سکے اور نہ لے بدی کا بدلہ"

تنزلِ اہلِ اسلام

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

ٹیکس

واعظ نے کہا کہ "وقت سب جاتے ہیں ٹل
اک وقت سے اپنے نہیں ٹلتی تو اجل"
کی عرض یہ ایک سیٹھ نے اٹھ کر کہ "حضور
ہے ٹیکس کا وقت بھی اسی طرح اٹل"

جیسی رعیت ہوگی ویسی ہی اس پر حکومت کی جائے گی

حاکم سے بھلائی کی توقع ہے محال
جب تک کہ رعیت کے بھلے نہ ہوں خصال
تم اپنے سوا کسی کے محکوم نہیں
عُمّال ہیں بس یہی تمھارے اعمال[۱]

عادت پڑی ہوئی مشکل سے جاتی ہے

ہو عیب کی خو یا کہ ہنر کی عادت
مشکل سے بدلتی ہے بشر کی صورت
چھٹتے ہی چھٹے گا اس گلی میں جانا
عادت اور وہ بھی عمر بھر کی عادت

۱۔ اس رباعی میں حدیث [نبوی ﷺ] کی طرف اشارہ ہے: عُمّا لُکُم اَعما لُکُم (حالی)۔

قصائد

قصیدۂ نعتیہ

بنے ہیں مدحتِ سلطانِ دوجہاںؑ کے لیے
سخن زباں کے لیے اور زباں دہاں کے لیے

وہ چاند جس سے ہوئی ظلمتِ جہاں معدوم
رہا نہ تفرقۂ روز و شب زماں کے لیے

وہ پھول جس سے ہوئی سعیٔ باغباں مشکور
رہی نہ آمد و رفتِ چمن خزاں کے لیے

وہ گونہ گونہ مدارا وہ بات بات میں مہر
کشائشِ گرہِ کینِ دشمناں کے لیے

گہہ افتخار مقابل میں اہلِ نخوت کے
گہہ انکسار مداراتِ میہماں کے لیے

کہیں ہلاک میں تاخیر قومِ سرکش کے
کہیں نماز میں تعجیل ناتواں کے لیے

صفائے قلب حسودانِ کینہ خواہ کے ساتھ
دعائے خیر بداندیش و بدگماں کے لیے

شفیعِ خلق سراسر خدا کی رحمت ہے
بشارت امتِ عاصی و ناتواں کے لیے

اسی کا دیں ہے کہ ہے گلشنِ ہمیشہ بہار
وگر نہ ہر گل و گلزار ہے خزاں کے لیے

نہ حرف وصوت میں وسعت نہ کام[1] ولب میں سکت
حقیقتِ شبِ معراج کے بیاں کے لیے

کرم کا دیکھیے دامن کہاں تلک ہو فراخ
ہو میزبان خدا جب کہ میہماں کے لیے

اگر نصیب ہو یثرب میں جا کے شربتِ مرگ
پیوں نہ آبِ بقا عمرِ جاوداں کے لیے

سمایا اس کا جو نقشِ قدم تصور میں
ہجومِ شوق میں بوسے کہاں کہاں کے لیے

حریفِ نعتِ پیمبر نہیں سخن حالی
کہاں سے لایئے اعجاز اس بیاں کے لیے

نبیؐ کا نام ہو وردِ زباں، رہے جب تک
سخن زباں کے لیے اور زباں دہاں کے لیے

۱۔ کام: حلق۔

مراثی

مرثیۂ غالب

کیا کہوں حالِ دردِ پنہانی　　وقت کوتاہ قصہ طولانی
عیشِ دنیا سے ہوگیا دل سرد　　دیکھ کر رنگِ عالمِ فانی
کچھ نہیں جز طلسم خواب و خیال　　گوشۂ فقر و بزمِ سلطانی
ہے سراسر فریب وہم و گماں　　تاج فغفور و تختِ خاقانی
نہ کروں تشنگی میں تر لب خشک　　چشمۂ خضر کا ہو گر پانی
لوں نہ اک مشتِ خاک کے بدلے　　گر ملے خاتمِ سلیمانی

بحرِ ہستی بجز سراب نہیں
چشمۂ زندگی میں آب نہیں

جس سے دنیا نے آشنائی کی　　اس نے آخر کو کج ادائی کی
تجھ پہ بھولے کوئی عبث اے عمر　　تو نے کی جس سے بے وفائی کی
ہے زمانہ وفا سے بیگانہ　　ہاں قسم مجھ کو آشنائی کی
یہ وہ ہے بے مہر کہ ہے اس کی　　صلح میں چاشنی لڑائی کی
ہے یہاں حظِ وصل سے محروم　　جس کو طاقت نہ ہو جدائی کی
خندۂ گل سے بے بقا تر ہے　　شان ہو جس میں دل ربائی کی
بات بگڑی رہی سہی افسوس　　آج خاقانی و سنائی کی

رشکِ عرفی و فخر طالب مُرد
اسداللہ خانِ غالب مُرد

بلبلِ ہند مر گیا ہیہات جس کی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں نکتہ سنج نکتہ شناس پاک دل پاک ذات پاک صفات
لاکھ مضموں اور اس کا ایک ٹھٹھول سو تکلف اور اس کی سیدھی بات
ہو گیا نقش دل پہ جو لکھا قلم اس کا تھا اور اس کی دوات
تھیں تو دلی میں اس کی باتیں تھیں لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات
اس کے مرنے سے مرگئی دلی خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات
یاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم یاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

دل کو باتیں جب اس کی یاد آئیں کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں
کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل کس سے دادِ سخن وری پائیں
مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں
پست مضموں ہے نوحۂ استاد کس طرح آسماں پہ پہنچائیں
اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح اہلِ انصاف غور فرمائیں
قدسی و صائب و اسیر و کلیم لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے ہے ادب شرط منھ نہ کھلوائیں

غالب نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

غزلیات

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا

ابرار[1] تجھ سے ترساں احرار[2] تجھ سے لرزاں
جو زد پہ تیری آیا اس کو گرا کے چھوڑا

کیا منعموں کی دولت کیا زاہدوں کا تقویٰ
جو گنج تو نے تاکا اس کو لٹا کے چھوڑا

فرہادِ کوہکن کی لی تو نے جانِ شیریں
اور قیسِ عامری کو مجنوں بنا کے چھوڑا

یعقوبؑ سے بشر کو دی تو نے ناصبوری
یوسفؑ سے پارسا پر بہتاں لگا کے چھوڑا

عقل و خرد نے تجھ سے کچھ چپقلش جہاں کی
عقل و خرد کا تو نے خاکہ اڑا کے چھوڑا

افسانہ تیرا رنگیں روداد تیری دِل کش
شعر و سخن کو تو نے جادو بنا کے چھوڑا

اک دسترس سے تیری حالی بچا ہوا تھا
اس کے بھی دل پہ آخر چرکا لگا کے چھوڑا

۱۔ ابرار: نیک لوگ۔
۲۔ احرار: آزاد لوگ؛ شرفاء۔

دیکھ اے امید کیجو ہم سے نہ تو کنارا
تیرا ہی رہ گیا ہے لے دے کے اک سہارا

اک شخص کو توقع بخشش کی بے عمل ہے
اے زاہدو! تمھارا ہے اس میں کیا اجارا

دنیا کے خرخشوں سے چیخ اٹھے تھے ہم اوّل
آخر کو رفتہ رفتہ سب ہو گئے گوارا

انصاف سے جو دیکھا نکلے وہ عیب سارے
جتنے ہنر تھے اپنے عالم میں آشکارا

افسوس! اہلِ دیں بھی مانندِ اہلِ دنیا
خود کام و خود نما ہیں خود بیں ہیں اور خود آرا

اُمت کو چھانٹ ڈالا کافر بنا بنا کے
اسلام ہے فقیہو! ممنوں بہت تمھارا

حالی سے کام ہے یاں فعلوں سے اس کے کیا کام
اچھا ہے یا برا ہے پھر یار ہے ہمارا

جہاں میں حالی کسی پہ اپنے سوا بھروسا نہ کیجیے گا
یہ بھید ہے اپنی زندگی کا بس اس کا چرچا نہ کیجیے گا

ہو لاکھ غیروں کا غیر کوئی نہ جاننا اس کو غیر ہرگز
جو اپنا سایہ بھی ہو تو اس کو تصور اپنا نہ کیجیے گا

کہے اگر کوئی تم کو واعظ کہ کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہو
زمانے کی خو ہے نکتہ چینی کچھ اس کی پروا نہ کیجیے گا
لگاؤ تم میں نہ لاگ زاہد نہ دردِ الفت کی آگ زاہد
پھر اور کیا کیجیے گا آخر جو ترکِ دنیا نہ کیجیے گا
تمھارا تھا دوستدار حالی اور اپنے بیگانے کا رضا جو
سلوک اس سے کیے یہ تم نے تو ہم سے کیا کیا نہ کیجیے گا

نفس دعوٰی بے گناہی کا سدا کرتا رہا
گرچہ اُترے جی سے اکثر دل ابا[1] کرتا رہا
حق نے احساں میں نہ کی اور میں نے کفراں میں کمی
وہ عطا کرتا رہا اور میں خطا کرتا رہا
چوریوں سے دیدۂ دل کی نہ شرمایا کبھی
چپکے چپکے نفسِ خائن[2] کا کہا کرتا رہا
نفس میں جو ناروا خواہش ہوئی پیدا کبھی
اس کو حیلے دل سے گھڑ گھڑ کر روا کرتا رہا
منھ نہ دیکھیں دوست پھر میرا اگر جانیں کہ میں
ان سے کیا کہتا رہا اور آپ کیا کرتا رہا
ایک عالم سے وفا کی تو نے اے حالی مگر
نفس پر اپنے سدا ظالم جفا کرتا رہا

۱۔ ابا کرنا: انکار کرنا، گریز کرنا۔
۲۔ خائن: خیانت کرنے والا، بددیانت۔

کہیں الہام منوانا پڑے گا کہیں کشف اپنا جتلانا پڑے گا

نہ ہو صوفی صفا گو تجھ میں لیکن کرشمہ کوئی دکھلانا پڑے گا

"نصیحت بے اثر ہے گر نہ ہو درد" یہ گُر ناصح کو بتلانا پڑے گا

جنھیں ہو جھوٹ کو سچ کر دکھانا اُنھیں سچّوں کو جھٹلانا پڑے گا

سخن میں پیروی کی گر سلف کی اُنھیں باتوں کو دہرانا پڑے گا

بہت یاں ٹھوکریں کھائی ہیں ہم نے بس اب دنیا کو ٹھکرانا پڑے گا

کاش اک جام بھی سالک کو پلایا جاتا اک چراغ اور سرِ راہ جلایا جاتا

کر دیا اس نے تو اللہ سے غافل ناصح اُس کو کیوں بھولتے گر اِس کو بھلایا جاتا

چپ چپاتے اسے دے آئے دل اک بات پہ ہم مال مہنگا نظر آتا تو چکایا جاتا

دل کو یہ تو نے دُکھایا ہے کہ دکھ جاتا ہے چیونٹی کا بھی اگر دل ہے دُکھایا جاتا

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

اب تو تکفیر سے واعظ نہیں ہٹتا حالی
کہتے پہلے سے تو دے لے کے ہٹایا جاتا

خلوت میں تری صوفی گر نورِ صفا ہوتا
تو سب میں ملا رہتا اور سب سے جدا ہوتا

کچھ اپنی حقیقت کی گر تجھ کو خبر ہوتی
میری ہی طرح تو بھی غیروں سے خفا ہوتا

پیش از ظہورِ عشق کسی کا نشاں نہ تھا تھا حسن میزبان کوئی میہماں نہ تھا

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا
سچ ہے کہ پاسِ خاطرِ نازک عذاب ہے تھا دل کو جب فراغ کہ وہ مہرباں نہ تھا
کچھ میری بے خودی سے تمھارا زیاں نہیں تم جاننا کہ بزم میں اک خستہ جاں نہ تھا
رات ان کو بات بات پہ سو سو دیے جواب مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا
رونا ہے یہ کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ یاں طعنِ رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا
بزمِ سخن میں جی نہ لگا اپنا زینہار
شب انجمن میں حالیؔ جادو بیاں نہ تھا

دل سے خیال دوست بھلایا نہ جائے گا سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا
تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا
اے دل رضائے غیر ہے شرطِ رضائے دوست زنہار بارِ عشق اٹھایا نہ جائے گا
مے تند و ظرفِ حوصلۂ اہل بزم تنگ ساقی سے جام بھر کے پلایا نہ جائے گا
راضی ہیں ہم کہ دوست سے ہو دشمنی مگر دشمن کو ہم سے دوست بنایا نہ جائے گا
جھگڑوں میں اہلِ دیں کے نہ حالی پڑیں بس آپ
قصہ حضور سے یہ چکایا نہ جائے گا

قلق اور دل میں سوا ہو گیا دلاسا تمھارا بلا ہو گیا
سبب ہو نہ ہو لب پہ آنا ضرور مرا شکر اس کا گلہ ہو گیا
وہ امید کیا جس کی ہو انتہا وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا
ہُوا رکتے رکتے دم آخر فنا مرض بڑھتے بڑھتے دوا ہو گیا
نہیں بھولتا اس کی رخصت کا وقت وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا

ٹپکتا ہے اشعارِ حالی سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

دردِ دل کو دوا سے کیا مطلب — کیمیا کو طلا سے کیا مطلب
چشمۂ زندگی ہے ذکر جمیل — خضر و آب بقا سے کیا مطلب
بادشاہی ہے نفس کی تسخیر — ظلِ[1] بالِ[2] ہما سے کیا مطلب
جو کریں گے بھریں گے خود واعظ — تم کو میری خطا سے کیا مطلب
جن کے معبود حور و غلماں ہیں — ان کو زاہد خدا سے کیا مطلب

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت — پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت
چُور تھا زخموں میں اور کہتا تھا دل — راحت اس تکلیف میں پائی بہت
آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا — دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت
ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا — خاکساری اپنی کام آئی بہت
کر دیا چپ واقعاتِ دہر نے — تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت

ہم نہ کہتے تھے کہ حالی چپ رہو سب
راست گوئی میں ہے رسوائی بہت

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

۱۔ ظل: سایہ۔ (مشہور ہے کہ جس پر ہما نامی پرندے کا سایہ ہوجائے اسے بادشاہی مل جاتی ہے)
۲۔ بال: بازو۔

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گل تر کی صورت

ہے غمِ روزِ جدائی نہ نشاطِ شبِ وصل
ہو گئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صورت

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

دیکھیے شیخ! مصور سے کھچے یا نہ کھچے
صورت اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت

واعظو! آتشِ دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

کیا خبر زاہدِ قانع کو کہ کیا چیز ہے حرص
اس نے دیکھی ہی نہیں کیسۂ زر کی صورت

حملہ اپنے پہ بھی اک بعدِ ہزیمت[1] ہے ضرور
رہ گئی ہے یہی اک فتح و ظفر کی صورت

رہنماؤں کے ہوئے جاتے ہیں اوسان خطا
راہ میں کچھ نظر آتی ہے خطر کی صورت

یوں تو آیا ہے تباہی میں یہ بیڑا سو بار
پر ڈرانی ہے بہت آج بھنور کی صورت

۱۔ ہزیمت: ہار، شکست۔

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

تو نہیں ہوتا تو رہتا ہے اچاٹ — دل کو یہ کیسی لگا دی تو نے چاٹ
رچ رہی ہے کان میں یاں لے وہی — اور مُغنّی[۱] نے کئی بدلے ہیں ٹھاٹ[۲]
ناؤ ہے بوسیدہ اور موجیں ہیں سخت — اور دریا کا بہت چکلا ہے پاٹ
اک کہانی پیر زن کی رہ گئی — راج کسریٰ کا رہا باقی نہ پاٹ
دیر[۳] سے مسجد میں ہم آئے تو ہیں — ہے مگر یاں جی کچھ اے زاہد اچاٹ
جو کہے تجھ کو بنا دیں اے امیر — ہیں بہت سرکار کی محفل میں بھاٹ
ملتیں رستوں کے ہیں سب ہیر پھیر — سب جہازوں کا ہے لنگر ایک گھاٹ
برق منڈلاتی ہے اب کس چیز پر — ٹڈیاں کب کی گئیں کھیتوں کو چاٹ
تیغ میں بُرّش یہ اے حالی نہیں — جس قدر تیری زباں کرتی ہے کاٹ
چٹکیاں سی دل میں لیتا ہے کون — شعر تو ظاہر میں ہیں تیرے سپاٹ

باپ کا ہے جبھی پسر[۴] وارث — ہو ہنر کا بھی اس کے اگر وارث
گھر ہنرور کا ناخلف نے لیا — تیرا ہے کون اے ہنر وارث
فاتحہ ہو کہاں سے میت کی — لے گئے ڈھو کے سیم و زر وارث
ہوں اگر ذوقِ کسب[۵] سے آگاہ — کریں میراث سے حذر[۶] وارث

۱۔ مُغنّی: گانے والا۔
۲۔ ٹھاٹ: انداز، گانے کا طریقہ۔
۳۔ دیر: دیر کے معنی یہاں ''تاخیر'' بھی ہیں اور ''مندر یا بت خانہ'' بھی۔
۴۔ پسر: بیٹا۔
۵۔ کسب: حاصل کرنے یا کمانے کا عمل۔
۶۔ حذر کرنا: بچنا۔

خاک و کرمان[1]، گور[2] و خویش و تبار[3] ایک میت اور اس قدر وارث
واعظو! دین کا خدا حافظ انبیاء کے ہو تم اگر وارث
قوم بے پر ہے دین بے کس ہے گئے اسلام کے کدھر وارث؟
ہم پہ بیٹھے ہیں ہاتھ دھوئے حریف جیسے مردے کے مال پر وارث
ترکہ چھوڑا ہے کچھ اگر حالی
کیوں ہیں میت پہ نوحہ گر وارث

بزم مے اچھی ہے گو دنیا ہے اے مے خوار ہیچ
یاں سمجھ لیتے تو ہیں دنیا کو دم بھر یار ہیچ
نفس سے سر بر ہوئی دانش نہ صبر و عقل و ہوش
ایک دشمن برسرِ کیں ہو تو ہیں سب یار ہیچ
شیخ! جو مخلص ہیں وہ رکھتے نہیں کچھ امتیاز
ہے یہ سب اونچی دکاں اور رونقِ بازار ہیچ
ہو گرجتے جس قدر اتنے برستے تم نہیں
اے فصیحو! ہے یہ سب گفتارِ بے کردار ہیچ
روئی تو آٹھ آٹھ آنسو اور پسیجا دل نہ ایک
نکلے موتی تیرے سب اے چشم گوہر بار ہیچ
ہے ادب مسند پہ جو کچھ ہے رئیس شہر کا
ہٹ کے مسند سے جو خود دیکھیں تو ہیں سرکار ہیچ

۱۔ کرمان: کیڑے۔
۲۔ گور: قبر۔
۳۔ خویش و تبار: اہلِ خانہ، گھر والے، خاندان والے۔

گو کہ حالیؔ اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

کاٹیے دن زندگی کے ان یگانوں کی طرح
جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح
منزلِ دنیا میں ہیں پا در رکاب آٹھوں پہر
رہتے ہیں مہماں سرا میں میہمانوں کی طرح
سعی[1] سے اکتاتے اور محنت سے کنیاتے[2] نہیں
جھیلتے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح
رسم و عادت پر ہیں کرتے عقل کو فرماں روا
نفس پر رکھتے ہیں کوڑا حکم رانوں کی طرح
شادمانی[3] میں گزرتے اپنے آپ سے نہیں
غم میں رہتے ہیں شگفتہ شادمانوں کی طرح
رکھتے ہیں تمکیں[4] جوانی میں بڑھاپے سے سوا
رہتے ہیں چونچال[5] پیری میں جوانوں کی طرح
پاتے ہیں اپنوں میں غیروں سے سوا بیگانگی
پر بھلا تکتے ہیں ایک اک کا یگانوں کی طرح

۱۔ سعی: کوشش۔
۲۔ کنیانا: جی چرانا۔
۳۔ شادمانی: خوشی۔
۴۔ تمکین: وقار۔
۵۔ چونچال: ہوشیار، مستعد؛ توانا۔

آس کھیتی کے پنپنے کی انھیں ہو یا نہ ہو
ہیں اسے پانی دیے جاتے کسانوں کی طرح

ان کے غصے میں ہے دل سوزی[1] ملامت[2] میں ہے پیار
مہربانی کرتے ہیں نامہربانوں کی طرح

کام سے کام اپنے ان کو گو ہو عالم نکتہ چیں
رہتے ہیں بتیس دانتوں میں زبانوں کی طرح

طعن سن سن احمقوں کے ہنستے ہیں دیوانہ وار
دن بسر کرتے ہیں دیوانوں میں سیانوں کی طرح

کیجیے کیا حالی نہ کیجیے سادگی گر اختیار
بولنا آئے نہ جب رنگیں بیانوں کی طرح

شادی[3] کے بعد غم ہے فقیری غنا کے بعد
اب خوف کے سوا ہے دھرا کیا رِجا[4] کے بعد

ہے سامنا بلا کا پس از عافیت ضرور
ہوتی ہے عافیت کی توقع بلا کے بعد

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

۱۔ دل سوزی: دردمندی، ہمدردی، خیر خواہی۔
۲۔ ملامت: برا بھلا کہنے کا عمل۔
۳۔ شادی: خوشی۔
۴۔ رجا: امید۔

کہیں خوف اور کہیں غالب ہے رجا اے زاہد
تیرا قبلہ ہے جدا میرا جدا اے زاہد
درگزر گر نہیں کرتا وہ گنہگاروں سے
تو ترا اور کوئی ہو گا خدا اے زاہد
ہم دکھا دیں گے کہ زہد اور ہے نیکی کچھ اور
کچھ بہت دور نہیں روزِ جزا اے زاہد

گھر ہے وحشت خیز اور بستی اجاڑ
ہو گئی ایک اک گھڑی تجھ بن پہاڑ
آج تک قصرِ[۱] امل[۲] ہے ناتمام
بندھ چکی ہے بارہا کھل کھل کے پاڑ[۳]
کھیلنا آتا ہے ہم کو بھی شکار
پر نہیں زاہد کوئی ٹٹی کی آڑ
دل نہیں روشن تو ہیں کس کام کے
سو شبستاں میں اگر روشن ہیں جھاڑ
عید اور نوروز ہے سب دل کے ساتھ
دل نہیں حاضر تو دنیا ہے اجاڑ

۱۔ قصر: محل۔
۲۔ امل: امید۔
۳۔ پاڑ: زیرِ تعمیر عمارت کے ساتھ بنا ہوا لکڑیوں کا ڈھانچا جس پر کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر راج اور مستری کام کرتے ہیں۔

کھیت رستے پر ہے اور رہرو سوار
کشت ہے سرسبز اور نیچی ہے باڑ
بات واعظ کی کوئی پکڑی گئی
ان دنوں کم تر ہے کچھ ہم پر لتاڑ
تم نے حالی کھول کر ناحق زباں
کر لیا ساری خدائی سے بگاڑ

جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز
دوستو دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز
کوچ سب کر گئے دلی سے ترے قدر شناس
قدر یاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز
تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز
ڈھونڈتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
صحبتیں اگلی مصوّر ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دل چسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

موج زن دل میں ہیں یاں خون کے دریا اے چشم
دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز

لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانا ہرگز

ہم کو گر تُو نے رلایا تو رلایا اے چرخ
ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز

یار خود روئیں گے کیا ان پہ جہاں روتا ہے
ان کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز

بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں
نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

یاں سے رخصت ہو سویرے کہیں اے عیش و نشاط
نہیں اس دور میں یاں تیرا ٹھکانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمھارا دلی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

شاعری مرچکی اب زندہ نہ ہو گی یارو
یاد کر کر کے اسے جی نہ کڑھانا ہرگز

غالب و شیفتہ و نیّر و آزردہ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز

مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطفِ شبانہ ہرگز

بزمِ ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

رنجش و التفات و ناز و نیاز — ہم نے دیکھے بہت نشیب و فراز
عشق کی آنچ اس میں پاتا ہوں — دل ذرا دیکھتا ہوں جس کا گداز
شیخ! اللہ رے تیری عیاری — کس توجہ سے پڑھ رہا ہے نماز
اک پتے کی جو ہم نے کہہ دی آج — رنگ واعظ کا کر گیا پرواز
ہم کو نسبت پہ فخر ہے تیری — تو گئی بھول ہم کو خاکِ حجاز

ق

خیر[1] ہے اے فلک کہ چار طرف — چل رہی ہیں ہوائیں کچھ ناساز

۱۔ یہ قطعہ اس وقت لکھا گیا تھا جب کہ ترکی کو سلطان عبدالعزیز خاں کے قتل کے بعد سرویہ [سربیا]، مانٹے نگرو اور روس وغیرہ کے مقابلے میں اخیر صدمہ پہنچا۔ (حالی)

رنگ بدلا ہوا ہے عالم کا ہیں دگر گوں زمانے کے انداز
ہوتے جاتے ہیں زور مند ضعیف بنتے جاتے ہیں مبتذل[1] ممتاز
چھپتے پھرتے ہیں کبک[2] و تیہو[3] سے گھونسلوں میں عقاب اور شہباز
ہے نہتوں کو رہ گزر میں خطر رہزنوں نے کیے ہیں ہاتھ دراز
ٹڈیوں کا ہے کھیتیوں پہ ہجوم بھیڑیوں کے ہیں خوں میں تر لبِ آز[4]
ناتوانوں پہ گدھ ہیں منڈلاتے گھائلوں پر ہیں ہیز[5] تیر انداز
تشنۂ خوں ہیں بھوکے شیروں کے حیلہ گر روبہوں کے عشوہ و ناز
دشمنوں کے ہیں دوست خود جاسوس اور یاروں کے یار ہیں غماز[6]
ہوگا انجام دیکھیے کیا کچھ ہے پرآشوب جبکہ یہ آغاز
لے ابھی تک کھلی نہیں لیکن غیب سے آ رہی ہے کچھ آواز
وقت نازک ہے اپنے بیڑے پر موج ہائل ہے اور ہوا ناساز
یا تھپیڑے ہوا کے لے ابھرے یا گیا کشمکش میں ڈوب جہاز
کام اسے اپنے سونپ دو حالی نہیں جس کا شریک اور انباز[7]
ہے وہ مالک ڈبوئے خواہ ترائے چارہ یاں کیا ہے غیر عجز و نیاز

ہر بشر سے اس کی مختص ہیں عطائیں خاص خاص
ہر مرض کو راس ہیں جیسے دوائیں خاص خاص

۱۔ مبتذل: ذلیل، حقیر۔
۲۔ کبک: چکور۔
۳۔ تیہو: چکور سے ملتا جلتا ایک پرندہ۔
۴۔ آز: لالچ، حرص۔
۵۔ ہیز: ہیجڑا، مخنث؛ مراد: بزدل، ڈرپوک؛ نامرد۔
۶۔ غماز: چغلی کرنے والا؛ آنکھ سے اشارہ کرنے والا۔
۷۔ انباز: شریک، ساتھی؛ ہم پلہ، نظیر۔

گو زمانے نے بھلا دی دل سے اپنے فصلِ گل
یاد ہیں لیکن وہ بلبل کی صدائیں خاص خاص
یوں تو ہے امید سب کچھ پہ نہ ہوں شاید معاف
وہ جو کی ہیں ہم نے اے حالی خطائیں خاص خاص

درد اور درد کی ہے سب کے دوا ایک ہی شخص
یاں ہے جلاد و مسیحا بخدا ایک ہی شخص
قافلے گزریں وہاں کیونکہ سلامت واعظ
ہو جہاں راہزن اور راہنما ایک ہی شخص
قیس سا پھر کوئی اٹھا نہ بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص
اعتراضوں کا زمانے کے ہے حالی یہ نچوڑ
شاعر اب ساری خدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص

چھپے ہیں حریفوں میں احرار واعظ
بُرا کہہ نہ رندوں کو زنہار واعظ
سدا قہر ہی قہر ہے عاصیوں[1] پر
نہ ستار ہے تو نہ غفّار واعظ
نکل آئے گی مے کشی کی بھی حلت[2]
کوئی مل گیا گر ہمیں یار واعظ
کوئی بات دیکھی نہیں تجھ میں لیکن
سنا ہے کہ ہوتے ہیں عیّار واعظ
ہمیں اور بھی تجھ سے کرتے ہیں بدظن
یہ جُبہ، یہ ریش اور یہ دستار واعظ
نہ چھوڑے گا زیور گھروں میں نہ زر تو
یہی ہے اگر حسنِ گفتار واعظ

۱۔ عاصی: گناہ گار۔
۲۔ حلت: حلال ہونے کی حالت یا کیفیت۔

مسلماں نہ ہم کاش حالی کو کہتے
ہوئے بات کہہ کر گنہگار واعظ

اے بہارِ زندگانی الوداع — اے شباب اے شادمانی الوداع
اے بیاضِ صبح پیری السلام — اے شبِ قدرِ جوانی الوداع
السلام اے قاصدِ ملکِ بقا — الوداع اے عمرِ فانی الوداع
روزگارِ ضعف و سستی الصلا[۱] — وقتِ سعی و جانفشانی الوداع

ق

فرصتِ عشق و جوانی الفراق — دورِ عیش و کامرانی الوداع
تجھ کو سمجھے تھے نعیمِ جاوداں — اے نعیمِ جاودانی الوداع
تیرے جاتے ہی گئیں سب خوبیاں — اے خدا کی مہربانی الوداع
آ لگا حالی کنارے پر جہاز
الوداع اے زندگانی الوداع

کل کبک سے چمن میں یہ کہتا تھا ایک زاغ
دیکھ اس خرامِ ناز پہ اتنا نہ کر دماغ
ہے تاک میں عقاب تو شہباز گھات میں
حملے سے یاں اجل کے نہیں ایک دم فراغ
یا رب نگاہِ بد سے چمن کو بچائیو
بلبل بہت ہے دیکھ کے پھولوں کو باغ باغ
جنگل میں تختۂ گلِ خودرو کو دیکھ کر
تازہ ہُوا زمانے کی ناقدریوں کا داغ

۱۔ الصلا: دعوت؛ کسی کو خوش آمدید کہتے وقت بولتے ہیں۔

عالمِ آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ
ہے زمیں ان کی اور ان کا آسماں سب سے الگ
پاک ہیں آلائشوں میں، بندشوں میں بے لگاؤ
رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ
جانچتے اوروں کو ہیں خود لے کے اپنا امتحاں
رکھتے ہیں اپنا طریقِ امتحاں سب سے الگ
کلبۂ احزاں ہے روشن ان کا جس مہتاب سے
ہے وہ نورِ مہر و ماہ و کہکشاں سب سے الگ
سیکڑوں پھندوں میں یاں جکڑا ہوا ہے بند بند
پر ٹٹولے کوئی دل ان کا تو واں سب سے الگ
شاعروں کے ہیں سب اندازِ سخن دیکھے ہوئے
دردمندوں کا ہے دکھڑا اور بیاں سب سے الگ
مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

صلح ہے اک مہلتِ سامانِ جنگ — کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفنگ[۱]
علم کیا؟ اخلاق کیا؟ ہتھیار کیا؟ — سب بشر کے مار رکھنے کے ہیں ڈھنگ
زہد و طاعت پر جوانوں کی نہ جاؤ — یہ بھی ہے اک نوجوانی کی ترنگ
پاک بازوں کو نہیں کچھ قیدِ وضع — جو ہیں اچھے ان پہ سب کھلتے ہیں رنگ
کام کا شاید زمانہ ہو چکا — دل میں اب اٹھتی نہیں کوئی امنگ
وہ عجائب اب نظر آتے ہیں کھیل — دیکھ پہلے جن کو رہ جاتے تھے دنگ

۱۔ تفنگ: بندوق۔

عقل شاید ملک میں باقی ہے کچھ　　ہے ابھی کم حاصل افیون و بھنگ
بڑھ گیا ہے رحم انسانی بہت　　ہوگی ایجاد اب نئی توپ اور تفنگ

قوم کو حالی نہیں راس اتفاق
پھوٹ[1] ہی کا بس کھلے گا ہم پہ رنگ

یاروں کو تجھ سے حالی اب سرگرانیاں ہیں
نیندیں اچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں

یاد اس کی دل سے دھو دے اے چشمِ تر تو مانوں
اب دیکھنی مجھے بھی تیری روانیاں ہیں

بنتے ہیں غیر اپنے ہوتے ہیں رام وحشی
الفت کی بھی جہاں میں کیا حکم رانیاں ہیں

کہتے ہیں جس کو جنت وہ اک جھلک ہے تیری
سب واعظوں کی باقی رنگیں بیانیاں ہیں

رحمت تری غذا ہے غصہ ترا دوا ہے
شانیں ہیں جتنی تیری جانِ جہانیاں ہیں

اپنی نظر میں بھی یاں اب تو حقیر ہیں ہم
بے غیرتی کی یارو اب زندگانیاں ہیں

ہر حکم پر ہوں راضی ہر حال میں رہیں خوش
حصے میں اب ہمارے یہ شادمانیاں ہیں

۱۔ پھوٹ: (۱) خربوزے کی طرح کا ایک پھل جو پک کر کھل جاتا ہے اور اس کا رنگ ہلکا پیلا ہو جاتا ہے۔
(۲) نااتفاقی، جھگڑا (یہاں دونوں معنی مراد ہیں)۔

خاور سے باختر تک جن کے نشاں تھے برپا
کچھ مقبروں میں باقی ان کی نشانیاں ہیں
دیکھا نہیں ابھی تک قحط الرجال تم نے
اس سے بھی سخت آنی آگے گرانیاں ہیں
کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو! اٹھتی جوانیاں ہیں
فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں
رونے میں تیرے حالی لذت ہے کچھ نرالی
یہ خوں فشانیاں ہیں یا گل فشانیاں ہیں

جب سے سنی ہے تیری حقیقت چین نہیں اک آن ہمیں
اب نہ سنیں گے ذکر کسی کا آگے کو ہوئے کان ہمیں
کچھ روزوں غفلت میں پھرے یاں ڈھونڈھتے ہم آسائش کو
کھل گئی جب دنیا کی حقیقت کچھ نہ رہا خلجان ہمیں
چل کے نئی اک چال فلک نے کھو دیے ہوش حریفوں کے
زد سے بچیں یا مات قبولیں اتنے نہیں اوسان ہمیں
پاس انھیں گر اپنا ذرا ہو جان اپنی بھی ان پہ یہ فدا ہو
کرتے ہیں خود نامنصفیاں اور کہتے ہیں نافرمان ہمیں
داد طلب سب غیر ہوں جب تو ان میں کسی کا پاس نہ ہو
بتلائی ہے زمانے نے انصاف کی یہ پہچان ہمیں

صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا
دیکھ کے اس کو سارے تمھارے آ گئے یاد احسان ہمیں
یاں تو بدولت زہد و ورع کے نبھ گئی خاصی عزت سے
بن نہ پڑا کل کے لیے جو کرنا تھا سامان ہمیں
سر تھے وہی اور تال وہی پر راگنی کچھ بے وقت سی تھی
غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں
غیر سے اب وہ بیر نہیں اور یار سے اب وہ پیار نہیں
بس کوئی دن کا اب حالی یاں سمجھو تم مہمان ہمیں

دیکھنا ہر طرف نہ مجلس میں
رخنے نکلیں گے سیکڑوں اس میں
کی نصیحت بری طرح ناصح
اور اک بس[1] ملا دیا بس میں
بے قدم دم ہیں خانقاہوں میں
بے عمل علم ہیں مدارس میں
ہو فرشتہ بھی تو نہیں انساں
درد تھوڑا بہت نہ ہو جس میں
جانور، آدمی، فرشتہ، خدا
آدمی کی ہیں سیکڑوں قسمیں
کی ہے خلوت پسند حالی نے
اب نہ دیکھو گے اس کو مجلس میں

پھونکا ہے فصلِ گل نے صور آ کے پھر چمن میں
اک حشر سا بپا ہے مُرغانِ نغمہ زن میں
بلبل کے آگ سی کچھ تن من میں لگ رہی ہے
بجلی گری فلک سے یا گل کھلا چمن میں

۱۔ بس: زہر۔

بادِ صبا گئی پھونک کیا جانے کان میں کیا
پھولے نہیں سماتے غنچے جو پیرہن میں

منہ سے دھواں سا اٹھا لیتے ہی نامِ اسلام
بارود بچھ رہی تھی گویا لب و دہن میں

گو رو چکے ہیں دکھڑا سو بار قوم کا ہم
پر تازگی وہی ہے اس قصۂ کہن میں

وہ قوم جو جہاں میں کل صدرِ انجمن تھی
تم نے سنا بھی اس پر کیا گزری انجمن میں

قبرِ اویسؓ[1] پر ہے بس فخر اب قرن[2] کو
زندہ اویسؓ کوئی باقی نہیں قرن میں

اس باغ کی خزاں نے کچھ خاک سی اڑا دی
فصلِ بہار گویا آئی نہ تھی چمن میں

حالی بس اب نہیں یاں سننے کی تاب باقی
مانا کہ ہے بہت کچھ وسعت تیرے سخن میں

نوکِ زباں نے تیری سینوں کو چھید ڈالا
ترکش میں ہے یہ پیکاں یا ہے زباں دہن میں

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

۱۔ اویسؓ: حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
۲۔ قرن: حضرت اویسؓ کا قبیلہ جس سے وہ قرنی کہلائے۔

ہیں دورِ جامِ اولِ شب میں خودی سے دور
ہوتی ہے آج دیکھیے ہم کو سحر کہاں

یا رب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں؟

اک عمر چاہیے کہ گوارہ ہو نیشِ[۱] عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں؟

بس ہو چکا بیاں کسل و رنج و راہ کا
خط کا مرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں؟

کون و مکاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر
اس خانماں خراب نے ڈھونڈھا ہے گھر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

حالیؔ نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح رہے رات بھر کہاں

اب وہ اگلا سا التفات نہیں جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں
مجھ کو تم سے[۲] پر اعتمادِ وفا تم کو مجھ سے پر التفات نہیں

۱۔ نیش: (۱) ڈنک؛ (۲) نوک (کسی آلے کی)۔
۲۔ مجھ کو تم سے پر...: یعنی تم جیسے آدمی پر۔ (حالی)

رنج کیا کیا ہیں ایک جان کے ساتھ زندگی موت ہے حیات نہیں
یوں ہی گزرے تو سہل ہے لیکن فرصتِ غم کو بھی ثبات نہیں
کوئی دل سوز ہو تو کیجیے بیاں سرسری دل کی واردات نہیں
ذرہ ذرہ ہے مظہرِ خورشید جاگ اے آنکھ دن ہے رات نہیں
قیس ہو کوہکن ہو یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

وحشت میں تھا خیالِ گل و یاسمن کہاں لائی ہے بوئے انس نسیمِ چمن کہاں
ہے بندگی کے ساتھ یہاں ذوقِ دید بھی جائے گا دیر چھوڑ کے اب برہمن کہاں
اہلِ طریق جس کو سمجھتے ہیں زادِ راہ واں دخل دست برد کو اے راہزن کہاں
لاتا ہے دل کو وجد میں اک حرفِ آشنا لے جائے ہم کو دیکھیے ذوق سخن کہاں
جی ڈھونڈتا ہے بزمِ طرب میں انھیں مگر وہ آئے انجمن میں تو پھر انجمن کہاں
دل ہو گیا ہے لذتِ غربت سے آشنا اب ہم کہاں ہوائے نشاطِ وطن کہاں
کہتا ہے خیر ہم بھی سہی دشمن آپ کے شکوے کو لے گیا ہے وہ بیدادِ فن کہاں
روکا بہت کل آپ کو حالی نے واں مگر
جاتا ہے محوِ شوق کا دیوانہ پن کہاں

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
کوئی دن بوالہوس بھی شاد ہو لیں دھرا کیا ہے اشاراتِ نہاں میں
دلِ پُر درد سے کچھ کام لوں گا اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ — مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ
تکلف علامت ہے بیگانگی کی — نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ
کرو دوستو پہلے آپ اپنی عزت — جو چاہو کریں لوگ عزت زیادہ
کرو علم سے اکتسابِ شرافت — نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ
فراغت سے دنیا میں دم بھر نہ بیٹھو — اگر چاہتے ہو فراغت زیادہ
جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے — نہیں لگتی کچھ اس میں دولت زیادہ
مصیبت کا ایک اک سے احوال کہنا — مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ
پھر اوروں کی تکتے پھرو گے سخاوت — بڑھاؤ نہ حد سے سخاوت زیادہ
کہیں دوست تم سے نہ ہو جائیں بدظن — جتاؤ نہ اپنی محبت زیادہ
جو چاہو فقیری میں عزت سے رہنا — نہ رکھو امیروں سے ملت زیادہ
نہیں چھپتے عیب اتنی ثروت سے تیرے — خدا دے تجھے خواجہ ثروت زیادہ
ہے الفت بھی وحشت بھی دنیا سے لازم — پہ الفت زیادہ نہ وحشت زیادہ
فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا — مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ
بکے مفت یاں ہم زمانے کے ہاتھوں — پہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ
ہوئی عمر دنیا کے دھندوں میں آخر — نہیں بس اب اے عقل مہلت زیادہ

غزل میں وہ رنگت نہیں تیری حالی
الاپیں[1] نہ بس آپ دُھرپت[2] زیادہ

۱۔ الاپنا: سُر لگانا، آواز کو اتارنا چڑھانا؛ مراد گانا۔
۲۔ دُھرپت: کلاسیکی موسیقی کا ایک انداز یا انگ، دُھرپد۔

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے
فیصلہ گردشِ دوراں نے کیا ہے سو بار
مرو کس کا ہے بدخشاں و ختن کس کا ہے
دم سے یوسفؑ کے جب آباد تھا یعقوبؑ کا گھر
چرخ کہتا تھا کہ یہ بیتِ حزن کس کا ہے
مطمئن اس سے مسلماں نہ مسیحی نہ یہود
دوست کیا جانیے یہ چرخِ کہن کس کا ہے
واعظ اک عیب سے تُو پاک ہے یا ذاتِ خدا
ورنہ بے عیب زمانے میں چلن کس کا ہے
آنکھ پڑتی ہے ہر اک اہلِ نظر کی تم پر
تم میں روپ اے گل و نسرین و سمن کس کا ہے
ہیں فصاحت میں مثل واعظ و حالی دونوں
دیکھنا یہ ہے کہ بے لاگ سخن کس کا ہے

ہوا کچھ اور ہی عالم میں چلتی جاتی ہے
ہنر کی عیب کی صورت بدلتی جاتی ہے
عجب نہیں کہ رہے نیک و بد میں کچھ نہ تمیز
کہ جو بدی ہے وہ سانچے میں ڈھلتی جاتی ہے
کہا جو میں نے وفا کرتے آئے ہیں احباب
کہا زمانے کی عادت بدلتی جاتی ہے

بہت سے کھو دیے خلجان بینوائی[۱] نے
ضرورت ایک کے بعد ایک ٹلتی جاتی ہے

اڑے گی خاک تقدس کی اب سرِ بازار
فقیہہ و شیخ میں جوتی اچھلتی جاتی ہے

نہ خوف مرنے سے جب تھا نہ اب ہے کچھ حالی
کچھ اک جھجک تھی سو وہ بھی نکلتی جاتی ہے

بری اور بھلی سب گزر جائے گی — یہ کشتی یونہی پار اتر جائے گی
ملے گا نہ گل چیں کو گل کا پتا — ہر اک پنکھڑی یوں بکھر جائے گی
رہیں گے نہ ملاح یہ دن سدا — کوئی دن میں گنگا اتر جائے گی
اِدھر ایک ہم اور زمانہ اُدھر — یہ بازی تو سو بسوے[۲] ہر جائے[۳] گی
بناوٹ کی شیخی نہیں رہتی شیخ — یہ عزت تو جائے گی پر جائے گی
نہ پوری ہوئی ہیں امیدیں نہ ہوں — یوں ہی عمر ساری گزر جائے گی
سنیں گے نہ حالی کی کب تک صدا — یہی ایک دن کام کر جائے گی

رہا کھل کے زاہد کا زہدِ ریائی — بنائی بہت بات پر بن نہ آئی
برائی ہے رندوں میں بھی شیخ لیکن — کہاں یہ برائی کہاں وہ برائی
گناہوں سے بچنے کی صورت نہیں جب — عبادت میں کیوں جان ناحق کھپائی
رکا ہاتھ جب بن گئے پارسا تم — نہیں پارسائی یہ ہے نارسائی

۱۔ بینوائی (بے نوائی): بے سروسامانی، بے کسی۔
۲۔ سو بسوے: یقیناً۔
۳۔ ہرجانا: شکست کھا جانا۔

خوشامد بھی ہم نے عجب چیز پائی　جو کہیے تو جھوٹی جو سنیے تو سچی
سمجھ ہم کو آئی پہ ناوقت آئی　ہوئی آ کے پیری میں قدرِ جوانی
جو واں دل پہ لی تھی تو یاں منہ کی کھائی　جوانی میں عاشق تھے اب ہم ہیں ناصح

قیاس آپ پر سب کو کرتے ہو حالی
نہیں اب بھی اچھوں سے خالی خدائی

اتنی ہی دشوار اپنے عیب کی پہچان ہے
جس قدر کرنی ملامت اور کی آسان ہے
دیکھ اے بلبل ذرا گلبن کو آنکھیں کھول کر
پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے
چیونٹیوں میں اتحاد اور مکھیوں میں اتفاق
آدمی کا آدمی دشمن خدا کی شان ہے
تجھ میں جوت اے شمع ہے کس برقِ عالم سوز کی
جان و دل سے تجھ پہ پروانہ جو یوں قربان ہے
دل میں حالی کے رہے باقی نہ بس ارمان کچھ
جی میں ہے کچھ اب اگر باقی تو یہ ارمان ہے

جب یہ کہتا ہوں کہ بس دنیا پہ اب تُف کیجیے
نفس کہتا ہے ابھی چندے[1] توقف کیجیے
دوست کے تیور ہیں ہم رنگ میں پہچانتے
بے تکلف ملیے ہم سے یا تکلف کیجیے

۱۔ چندے: ذرا، تھوڑا۔

جبکہ عقبیٰ مل گئی دنیا ہے پھر سہل الوصول
شیخ لگتے ہاتھ اس پر بھی تصرّف کیجیے
توبہ حضرت کی یوں ہی اک دودھ کا سا ہے ابال
ہم دکھا دیں گے ذرا دم بھر توقف کیجیے

کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے
بات اس کی کاٹتے رہے اور ہم زباں رہے
یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے
کل کی خبر غلط ہو تو جھوٹے کا رو سیاہ
''تم مدعی کے گھر گئے اور میہماں رہے''
دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے
حالی کے بعد کوئی نہ ہمدرد پھر ملا
کچھ راز تھے کہ دل میں ہمارے نہاں رہے

ملنے کی جو نہ کرنی تھی تدبیر کر چکے
آخر کو ہم حوالۂ تقدیر کر چکے
کہتے ہیں طبعِ دوست شکایت پسند ہے
ہم شکوہ ہائے غیر بھی تحریر کر چکے

حالی اب آؤ پیروئ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

نہ واں پرسش نہ یاں تابِ سخن ہے
محبت ہے کہ دل میں موج زن ہے
بہت لگتا ہے دل صحبت میں اس کی
وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے
دلاتی ہے صبا کس کو چمن یاد
نہ میں بلبل نہ گھر میرا چمن ہے
بھلا حالی اور الفت سے ہو خالی
یہ سب تم صاحبوں کا حسنِ ظن ہے
کیا ہے اس نے کہتے ہیں سخن ترک
مگر ہم کو ابھی اس میں سخن ہے

دھوم تھی اپنی پارسائی کی — کی بھی اور کس سے آشنائی کی
کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت — ہم کو طاقت نہیں جدائی کی
منھ کہاں تک چھپاؤ گے ہم سے — تم کو عادت ہے خودنمائی کی
لاگ میں ہیں لگاؤ کی باتیں — صلح میں چھیڑ ہے لڑائی کی
نہ ملا کوئی غارتِ ایماں — رہ گئی شرم پارسائی کی

دل کو درد آشنا کیا تو نے　　دردِ دل کو دوا کیا تو نے
طبعِ انساں کو دی سرشتِ وفا　　خاک کو کیمیا کیا تو نے
وصلِ جاناں محال ٹھہرایا　　قتلِ عاشق روا کیا تو نے
تھا نہ جز غم بساطِ عاشق میں　　غم کو راحت فزا کیا تو نے

حالی اٹھا ہلا کے محفل کو
آخر اپنا کہا کیا تو نے

وصفِ چمن قفس میں سنو عندلیب سے
پوچھو وطن کی قدر مسافر غریب سے
لاگ اور لگاؤ ساتھ گئے سب شباب کے
نفرت رقیب سے نہ اب الفت حبیب سے
نعم البدل ہے داغ کا حالی کلامِ داغ
ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

سلف کی دیکھ رکھو راستی اور راست اخلاقی
کہ ان کے دیکھنے والے ابھی کچھ لوگ ہیں باقی
نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی لیکن
حذر اس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاقی
نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں
یہ گل چینی ہے یا لٹس ہے گل چیں یا ہے قزاقی

کمالِ کفش دوزی علم افلاطوں سے بہتر ہے
یہ وہ نکتہ ہے سمجھے جس کو مشّائی[1] نہ اشراقی[2]

ہمارے ظرف ہی انعام کے قابل نہیں ورنہ
لُنڈھائے خم پہ خم غیروں پہ کیوں ممسک ہو گر ساقی

مدارج کوشش و تدبیر کے سب ہو چکے حالی
لطیفہ[3] رہ گیا ہے دیکھنا اک غیب کا باقی

فکرِ فردا کی گلے پڑ گئی عادت کیسی
جان کو ہم نے لگا لی یہ علت کیسی

جب خزاں ہو گئی آخر تو رہا بیمِ خزاں
جن کی قسمت میں ہو کلفت انھیں راحت کیسی

جیتے جی رکھ نہ فراغت کی توقع ناداں
قیدِ ہستی میں مری جان فراغت کیسی

عیب جوئی سے نہیں خلق کی دم بھر فارغ
جن کو کچھ کام نہیں یاں انھیں فرصت کیسی

جو حقیقت سے ہیں آگاہ تری اے دنیا
وہ نہیں جانتے ہوتی ہے مصیبت کیسی

۱۔ مشّائی: فلسفی جو علم کو دلیل سے جاننے کا قائل ہو، ارسطوئی۔
۲۔ اشراقی: فلسفی جو علم کے متصوفانہ نظریے کو مانتا ہو اور مکاشفے اور الہام کے ذریعے تحصیلِ علم کا قائل ہو، مشّائی کی ضد۔
۳۔ لطیفۂ غیب: اس سے مراد توفیقِ الٰہی اور لطفِ خداوندی ہے۔ غیبی امداد کے معنی میں بھی آتا ہے۔

حالی

حالی کے دیوانِ غزلیات میں مومن و غالب کی نزاکت و لطافت کا بھی اثر ہے اور درد و مصحفی کی سادگی و جاذبیت بھی۔ — حامد حسن قادری

جدید اردو شاعری کے لیے مولانا حالی کی شخصیت ایک انقلابی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے قصیدہ، غزل، مثنوی، رباعی وغیرہ مختلف اصنافِ سخن میں تجدید و تخلیق سے کام لیا ہے اور روایات کو قائم رکھتے ہوئے ان روایات سے بغاوت بھی کی ہے۔ — غلام مصطفیٰ خاں

حالی ایک باشعور فن کار ہیں۔ ان کی اکثر یک رخی تصویریں بھی زبانِ حال سے بہت کچھ کہتی ہیں۔ انھوں نے جس طرح انگریزی طرزِ حکومت کے محاسن و معائب پر نظر ڈالی ہے وہ ان کی سیاسی بصیرت پر دال ہے۔ سرسید کے یہاں ہمیں اس غیر ملکی سامراجی نظام کا صرف روشن پہلو نظر آتا ہے۔

— معین احسن جذبی

حالی کی نئی شاعری اور ان کی نئی تنقید کثیر المقاصد تھی۔ — ممتاز حسین

الطاف حسین حالی، غالب اور اقبال کی درمیانی شخصیت ہیں۔ دو مفکر شاعروں کے درمیان ایک مصلح شاعر جو اردو کے پہلے نقاد بھی تھے۔ یہ پل عبور کرنے میں آسان مگر تعمیر کرنے میں مشکل تھا۔ — محمد رضا کاظمی

ISBN 978-0-19-906276-8

OXFORD
UNIVERSITY PRESS

www.oup.com
www.oup.com/pk

RS 135